Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 02, December 2025

تحقیقی وتنقیدی مجلّہ
دریافت

Received: 13th August, 2025 | Accepted: 12th December, 2025 | Available Online: 31st December, 2025
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v17i02.421

تصورِ خُدا اور حقیقتِ دُعا: اقبال کے تیسرے خُطبے کا تحقیدی مطالعہ

The Concept of God and the Reality of Prayer: A Critical Analysis of Iqbal's Third Lecture

DR. TALIB HUSSAIN HASHMI[1] AND ATTIA QUDUS[2]

[1] Assistant Professor (Adjunct Faculty), Department of Urdu, MY University Islamabad, Pakistan

[2] M. Phil Urdu Scholar, Department of Urdu, MY University Islamabad, Pakistan

Corresponding author: Dr. Talib Hussain Hashmi (talib.hashmi@gmail.com)

CONFLICT OF INTEREST: The authors declare that there are no conflicts of interest related to the research, authorship, and/or publication of this article, and that the data presented have not been fabricated or falsified.

FUNDING: This research did not receive any specific grant or financial support from public, commercial, or not-for profit funding agencies.

PARTICIPANT CONSENT: The authors confirm that Informed consent was obtained from all participants, and confidentiality was duly maintained.

KEYWORDS: Concept of God, Prayer, Divine Immanence, Ego, Spiritual Experience, Modern Islamic Thought, Metaphysics, Religious Psychology

ABSTRACT: This paper presents an in-depth critical analysis of Allama Muhammad Iqbal's third lecture in The 'Reconstruction of Religious Thought in Islam', titled "The Concept of God and the Reality of Prayer." In this lecture, Iqbal redefines the traditional theological understanding of God by integrating Qur'anic insights with modern philosophical thought. He challenges the classical metaphysical notion of a static, impersonal, and purely transcendent deity and instead advances the concept of a Living God, dynamic, creative, and intimately involved in the ongoing process of cosmic evolution. According to Iqbal, God is not a remote Being detached from human affairs but the ultimate source of life, movement, and purpose in the universe. This study examines the philosophical, metaphysical, and epistemological implications of this conception, highlighting Iqbal's efforts to harmonize spiritual intuition with scientific rationality. It further emphasizes Iqbal's understanding of prayer as a profound spiritual dialogue between the human and the Divine rather than a mere ritual. Prayer, in this view, strengthens moral character, purifies the self, and fosters creativity, ethical awareness, and purposeful action. The paper concludes that Iqbal's conception of God and prayer presents a transformative religious vision that unites faith, reason, and human agency, remaining relevant to contemporary philosophical and spiritual discourse.

This work is licensed under a Creative Commons Attribution-Non Commercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

فکرِ اقبال اسلامی فلسفہ اور روحانی فکر میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے، جو نہ صرف مسلمانوں کی روحانی بیداری کا سبب بنی بلکہ انہیں عصری فکر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش بھی کرتی رہی۔ اقبال نے اپنے علمی اور فکری مشاہدات کے ذریعے خدا اور

انسان کے تعلق کو نئے معنوں میں پیش کیا۔ ان کے نزدیک خدا صرف ایک بعید اور ماوراوجود نہیں، بلکہ ایک زندہ، تخلیقی اور انسانی زندگی میں مؤثر قوت ہے۔ یہی تصور اقبال کی فلسفیانہ بصیرت کی بنیاد ہے، جس میں انسان کی خودی اور تخلیقی صلاحیتیں خدا کے ساتھ تعلق کے ذریعے ارتقاپذیر ہوتی ہیں۔

اقبال کے تیسرے خُطبے "تصورِ خُدا اور حقیقتِ دُعا" میں یہ موضوع خصوصی اہمیت اختیار کرتا ہے۔ اس خطبے میں اقبال نہ صرف خدا کے تصور کو متحرک اور عملی معنی میں پیش کرتے ہیں بلکہ دعا کو بھی ایک فعال اور متحرک روحانی عمل کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک دعا محض ظاہری عبادت نہیں بلکہ انسانی خودی کو قوت بخشنے، اخلاقی شعور اجاگر کرنے اور تخلیقی صلاحیتیں فروغ دینے کا ذریعہ ہے۔ جب ہم انسانی تاریخ کے اوراق کو پلٹتے ہیں تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ انسان کا شعور ہمیشہ ایک ایسی طاقت، ایسی ہستی کے تصور کا قائل رہا ہے جو اس کائنات سے ماورا، ہر چیز پر غالب اور لامحدود قدرت کی حامل ہو۔ اسی تصورِ خدا نے مذہبی فکر، اخلاقی نظام اور روحانی تجربات کو تشکیل دیا۔ علامہ محمد اقبالؒ بھی تصورِ خدا کو انسانی زندگی کی معنویت اور مقصدیت کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک خدا کا تصور محض فلسفیانہ یا تجریدی خیال نہیں بل کہ ایک زندہ، متحرک، فعال اور شخصی حقیقت ہے جس سے انسان کا تعلق دعا کے ذریعے اُستوار ہوتا ہے۔ دعا کو اقبال ایک ایسے عمل کے طور پر دیکھتے ہیں جو نہ صرف انسان کی داخلی کیفیت کو بدلتا ہے بلکہ اس کے خارجی حالات اور کائناتی نظام پر بھی اثرانداز ہوتا ہے۔ ان کا مشہور تیسرا خطبہ اس موضوع پر ان کی گہری اور فکری بصیرت کا مظہر ہے جس میں اُنھوں نے خدا کے تصور کو جدید فلسفہ، سائنس اور اسلامی صوفیانہ روایات کی روشنی میں جانچنے کی کوشش کی۔

یہ مقالہ "تصورِ خُدا اور حقیقتِ دُعا " کے باہمی ربط کا توضیحی مطالعہ پیش کرے گا۔ اس میں یہ واضح کیا جائے گا کہ مختلف دینی اور فلسفیانہ مکاتبِ فکر کس طرح خدا کو ایک شخصی، غیر شخصی، یا مظہرِ مطلق کے طور پر بیان کرتے ہیں اور ان کے مطابق دعا کی نوعیت، حقیقت اور مقصدیت کیا بنتی ہے۔ ساتھ ہی یہ سوال بھی زیرِ بحث لایا جائے گا کہ آیا دعا تقدیر اور الٰہی ارادے میں تبدیلی پیدا کرتی ہے یا یہ انسان کے شعور وارادے کو اس کی اصل حقیقت سے ہم آہنگ کر دیتی ہے۔ اس مطالعے میں خاص طور پر علامہ اقبالؒ کے نظریات، قرآن مجید کی تعلیمات، اسلامی صوفیہ کے تصورات اور جدید فلسفیانہ تعبیرات کو موضوع بنایا جائے گا تاکہ دعا کی فلسفیانہ، نفسیاتی اور روحانی جہات کا ہمہ گیر تجزیہ سامنے آسکے۔

علامہ اقبال نے مسلمانوں کی فِکری نشاۃ ثانیہ کے لیے سلسلہ وار سات خطبات انگریزی میں پیش کیے جو اردو میں "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" کے نام سے شائع ہوئے۔ اِن خطبات میں سے ان کا تیسرا خطبہ بعنوان "تصورِ خدا اور حقیقتِ دعا" نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ علامہ اقبال ایک ممتاز شاعر اور فلسفی تھے جن کی گہری بصیرت نے جدید فکر کو تشکیل دیا۔ اُنھوں نے مستند اسلامی اور قرآنی اصولوں پر مبنی ایک جامع فلسفیانہ نظام تیار کیا، جس کا مقصد انسانیت کو درپیش بنیادی مسائل کو حل کرنا تھا۔ اقبال کا کام روحانی اور اَخلاقی اَقدار کی گہری تفہیم کی عکاسی کرتا ہے، ایسے حل پیش کرتا ہے جو آج کی دنیا کے متعلقہ ہیں۔ ان کی شاعری اور خیالات لاکھوں لوگوں کو متاثر کرتے رہتے ہیں، جو خود آگاہی، ایمان اور اسلامی تعلیمات میں جڑے ہوئے مقصد کے نئے احساس کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔

علامہ محمد اقبال نے مسلمانوں کو فکری بیداری عطا کرنے، روحانی الجھنوں کا حل پیش کرنے اور اسلام کی ابدی حقانیت کو واضح کرنے کے لیے نظم ونثر دونوں میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ان کی شاعری کا خزانہ "کلیاتِ اقبال" کی صورت میں محفوظ ہے، جس میں ان کے تمام شعری مجموعے شامل ہیں، جب کہ نثر میں ان کا سب سے اہم اور عالمی سطح پر معروف کارنامہ " تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ " ہے، جو سات خطبات پر مشتمل ہے اور اسلامی فکر کو جدید دنیا کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ایک عظیم کوشش ہے۔

ان خطبات کی تیاری میں علامہ محمد اقبال نے شبانہ روز محنت کی اور سیٹھ محمد جمال کی دعوت پر ایک ایک کر کے مختلف مقامات پر خطبہ پڑھنے کا اہتمام ہوا۔ جہاں یہ خطبات پڑھے گئے ان مقامات میں مدراس، بنگلور، میسور، حیدر آباد دکن، علی گڑھ اور لندن (ساتواں خطبہ) شامل ہیں۔ ابتدائی طور پر چھے خطبات کو یک جا کر کے ۱۹۳۰ء میں طباعت کا اہتمام ہوا۔ علامہ محمد اقبال کتاب کے دیباچے میں ان خطبات کی غرض وغایت کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ یہ مدراس کی مسلم ایسوسی ایشن کی درخواست پر علی گڑھ، مدارس اور حیدر آباد میں پڑھے گئے۔ اس وقت ان کی تعداد چھے تھی اس لیے ان مقامات میں لندن کا ذکر نہیں کیا گیا۔ مزید لکھتے ہیں کہ ان خطبات کو دنیا میں ہونے والی ترقی اور جدید فکر کی لحاظ سے یوں پیش کیا گیا ہے کہ علومِ جدیدہ سے تعلق رکھنے والے انسان کی ذہنی ہم آہنگی ہو سکے۔

دیباچے میں علامہ اقبال یہ بات واضح کرتے ہیں کہ دورِ جدید کا انسان ہر چیز کو محض تقلید کی بنیاد پر قبول کرنے کے بجائے تنقیدی نظر سے دیکھنے کا عادی ہو گیا ہے۔ وہ ہر عقیدے، فلسفے اور نظریے کو شک کی کسوٹی پر پرکھتا ہے اور پھر عقل و دلیل کی روشنی میں حقائق تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ طرزِ فکر دراصل خود اسلام کی عطا کردہ میراث ہے، کیوں کہ اسلام نے انسان کو غور وفکر، تدبر اور تحقیق کی تعلیم دی، جس کے نتیجے میں مسلمان علمی، سائنسی اور فکری میدانوں میں دنیا کی رہنمائی کرنے لگے۔ اقبال کے یہ خطبات خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقے، دانشوروں اور اہلِ فکر و نظر کے لیے تھے، تاکہ وہ اسلام کے گہرے فلسفیانہ اور الٰہیاتی تصورات کو جدید عقلی تقاضوں کے تناظر میں بہتر طور پر سمجھ سکیں اور دنیا کے سامنے اسلام کی حقیقی روح اور آفاقی پیغام کو دلیل و حکمت کے ساتھ پیش کر سکیں۔

ان خطبات کے عنوانات درج ذیل ہیں:

۱۔ علم اور مذہبی مشاہدات

۲۔ مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار

۳۔ خُدا کا تصور اور حقیقتِ دُعا

۴۔ انسانی خودی، اس کی آزادی اور لافانیت

۵۔ اسلامی ثقافت کی روح

۶۔ اِسلام میں حرکت کا اصول

۷۔ کیا مذہب کا امکان ہے [1]

ان خطبات کے موضوعات میں فکر و فلسفہ، سائنس اور اسلام کے اہم مباحث شامل ہیں اور یہ ساتوں خطبات مربوط ہیں۔ جب تک پہلے خطبے کو پڑھا اور نہ سمجھا جائے، اگلے خطبے کا مطالعہ کرتے ہوئے بین السطور تک رسائی مشکل ہو جاتی ہے؛ البتہ آخری دو خطبات کو الگ سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے پہلے خطبے میں مذہب بطور ذریعہ علم سے بحث کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دیگر ذرائع علوم ہی کی طرح مذہب بھی ایک ذریعہ علم ہے اور ایسا ذریعہ ہے جو دیگر تمام علوم سے زیادہ مستند اور وسیع ہے۔ اس میں علم، وجدان، وحی، روحانیت، علمی تحاریک، مذہبی یا روحانی تجربہ اور اس کے مشمولات شامل ہیں۔

دوسرے خطبے میں علامہ اقبال نے مذہبی تجربے کو فلسفیانہ انداز میں پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس پرکھ میں انھوں نے جدید سائنسی علوم (طبیعیات، حیاتیات اور نفسیات)، زمان و مکاں کے نظریات اور مذہب سے بحث کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ مذہب ہر حوالے سے برتر اور جامع ہے جب کہ ان تمام علوم کی بنیادیں اور نظریات مستقل طور پر تبدیلی سے گزر رہے ہیں۔ اسی میں انھوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات کی شہادت یا بالفاظِ دیگر علم الکلام کے تین قدیم تصورات (وجودی، غائی اور کونی) سے بحث کرتے ہوئے ان پر اعتراضات بھی کیے ہیں۔

تیسرے خطبے "خدا کا تصور اور حقیقت دُعا" کا آغاز اس کے مفہوم سے کیا ہے۔ موضوعاتی حوالے سے دیکھیں تو پہلے خطبے میں جہاں یہ کہا گیا کہ مذہب دیگر تمام ذرائع علوم سے برتر ہے وہیں دوسرے خطبے میں اسے سائنس اور دیگر علوم پر پرکھنے کی کوشش کی گئی تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ واقعی یہ ایک ناقابلِ فراموش حقیقت ہے۔ اب تیسرے خطبے میں وہ اسی بحث کو اس جانب موڑتے ہیں کہ اگر خدا کا تصور کریں تو کیسے کریں یا خدا کے وجود کی ماہیت و نوعیت کیا ہے۔ محمد شریف بقا کے مطابق اس خطبے کے اہم نکات میں شامل ہے کہ "مذہب سے حقائق کی عملی تعبیر ممکن ہے، انائے مطلق کی صفات کیا ہیں اور اسے زمانی و مکانی پیمانوں سے ناپ نہیں سکتے، اسلام تصورِ خدا، نظریہ تخلیقِ کائنات؟ قلب و قالب یا مادہ و روح کی بحث، کائنات کی اصل روحانی، فلسفہ زمان و مکان، خودی اور زمانے کا آپس میں تعلق کی نوعیت، فلسفہ جبر و قدر، مسئلہ خیر و شر اور قصہ آدم و ابلیس کی حقیقت، دعا اور نماز کی حقیقت۔"[۲]

مشرق کے عظیم شاعر اور مفکر علامہ محمد اقبال اپنے جوش وولولے کے ساتھ نہ صرف مسلمانوں بلکہ پوری انسانیت کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ حقیقی فلاح، دائمی سکون، اور بین الانسانی ہم آہنگی کا راستہ اسلام کی عالمگیر تعلیمات ہی میں پوشیدہ ہے۔ ان کی شاعری اور فلسفے کا بنیادی محور یہ ہے کہ انسان روحانی بیداری اور اخلاقی استحکام کے ذریعے ہی عصری چیلنجوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اقبال کی دعوت محض عقیدے کی قبولیت تک محدود نہیں، اس میں انسانیت کی یکجہتی، عالمی امن اور خُود شناسی کی گہری اپیل موجود ہے۔ ان کا پیغام آج بھی لوگوں کو اس بات کی تحریک دیتا ہے کہ وہ اپنی اندرونی قوت کو پہچانیں، اپنے کردار کو بلند کریں اور روحانی ارتقا کے ذریعے سماجی ترقی و فلاح کو ممکن بنائیں۔ ڈاکٹر طاہر حمید تنولی لکھتے ہیں:

> "اسلام نے قدیم رسم و رواج کو خالق کے ساتھ ایک متحرک، ذاتی تعلق میں بدل کر روایتی مذہب میں انقلاب برپا کیا۔ اس نے مہذب زندگی میں نئے افق کھولے، ایمان والوں کو ایمان کو نہ صرف رسم کے طور پر دیکھنے کی ترغیب دی، بل کہ ایک فعال، شعوری قوت کے طور پر جو

روزمرہ کے اعمال اور فیصلوں کو متاثر کرتی ہے۔ اس تبدیلی کے نقطہ نظر نے روحانی اور اخلاقی اقدار کی گہری سمجھ کو فروغ دیا، لوگوں کو علم حاصل کرنے، ہمدردی پر عمل کرنے اور حقیقی عقیدت اور روشن خیال بیداری سے جڑے ایک ہم آہنگ معاشرے کی تعمیر کی ترغیب دی۔"(۳)

خلیفہ عبدالحکیم علامہ اقبال کے اولین شارحین میں شامل ہیں۔ ان کے مطابق متنوع موضوعات، جامعیت اور صراحت کی وجہ سے یہ خطبہ علامہ اقبال کی فکر کا سب سے بڑا عکاس اور خلاصہ ہے۔ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"اس خطبے میں علامہ محمد اقبال کے افکار و استدلال کا خلاصہ ہے۔"(۴)

عبادات کے حوالے سے بھی اقبال کے افکار اسلام کے عین مطابق ہیں۔ دنیا کے دیگر مذاہب کی طرح اسلام بھی عبادات، اذکار اور دعاؤں کے سلسلے میں ممتاز ہے۔ اقبال کے اردو فارسی کلام میں جابجا نماز اور دعا کی تاکید ملتی ہے۔

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود
ہوتی ہے بندہ مومن کی اذاں سے پیدا(۵)

علامہ اقبال نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ فجر کے وقت دی جانے والی اذان محض نماز کی پکار نہیں، بلکہ یہ ایک الٰہی یاد دہانی ہے جو انسان کے دل و دماغ سے غفلت، جہالت اور مایوسی کے اندھیروں کو دُور کر کے اسے بیداری، امید اور عمل کی طرف بلاتی ہے۔ یہ اذان انسان کو اس کے اصل مقصدِ حیات کی یاد دہانی کراتی ہے کہ اس کی زندگی کا ہر لمحہ عبادت، خدمت اور تعمیری جدوجہد سے عبارت ہونا چاہیے۔ یہ مقدس آواز اُمید اور روشن خیالی سے بھرے ایک نئے دن کی آمد کا پیغام دیتی ہے۔ وہ شاعرانہ طور پر جھوٹ کا مقابلہ کرتا ہے، جس کی علامت شب (شب) ہوتی ہے، اس سچائی اور راست بازی کے ساتھ جو صبح ہوتی ہے۔ اقبال کے الفاظ مومنوں کو ایمان قبول کرنے کی ترغیب دیتے ہیں، ہر نئی صبح کے ساتھ ان کی روحوں کو سچائی کی روشنی اور روحانی بیداری سے بیدار کرتے ہیں۔ این میری شمل لکھتی ہیں۔

"محمد اقبال کا بہترین کلام دعائیہ نظموں پر مشتمل ہے یا نماز کے جذبے نے انھیں مہمیز دی ہے۔"(۶)

علامہ اقبال نہ صرف نماز کے پابند تھے بلکہ تہجد گزار بھی تھے۔ ان کی زندگی میں عبادت کو مرکزی مقام حاصل تھا۔ حیدرآباد دکن کے وزیر اعظم کو ان کی بیٹی کی علالت کے سلسلے میں لکھے گئے ایک خط میں اقبال اپنی روحانی کیفیت اور دعا کی تاثیر کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ان شاء اللہ، کل فجر کی نماز کے بعد بھی دعا کروں گا اور تہجد کی نماز سے پہلے اور بعد بھی۔ اس وقت دل کو جو سکون، روح کو جو قربت اور عبادت میں جو کیف حاصل ہوتا ہے، اس میں مانگی جانے والی دعا کی قبولیت کی امید بھی بڑھ جاتی ہے۔"(۷)

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک عبادت محض ایک رسمی عمل نہیں تھی۔ وہ اسے خدا سے قربت اور روحانی سرور کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ تہجد کی نماز ان کے لیے خصوصی اہمیت رکھتی تھی، کیونکہ یہ وقت سکون، خلوت اور خالص توجہ کا وقت ہوتا ہے جب انسان اپنے رب کے حضور پوری یکسوئی سے دعا کرتا ہے اور اس وقت مانگی گئی دعائیں خاص تاثیر رکھتی ہیں۔ یہ اقتباس اقبال کی عملی زندگی میں عبادت کی گہرائی اور دعا کی روحانی حقیقت پر ایمان کو نمایاں کرتا ہے۔ یہ الفاظ اقبال کی اس گہری خدا پرستی اور دعا پر یقین کو ظاہر کرتے ہیں، جو اِن کے فکری نظام کی بنیاد تھی اور جس نے ان کی شخصیت کو روحانی جلال اور اخلاقی عظمت عطا کی۔

علامہ اقبال اپنے تیسرے خطبے "تصورِ خدا اور حقیقتِ دعا" کی ابتدا میں یہ واضح کرتے ہیں کہ مذہب کے احکامات اور اس کے فیصلے صرف عقیدے کی بنیاد پر ہی نہیں، بلکہ عقل کی کسوٹی پر بھی پورے اُترتے ہیں۔ ان کے مطابق اگر ہم عقل و فکر کا استعمال کرتے ہوئے اس کائنات اور اس کے نظام کا بغور مشاہدہ کریں تو ہمیں لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ اس پوری تخلیق کے پیچھے کوئی عظیم ہستی، کوئی مطلق وجود یا کامل خودی ضرور ہے جو اسے قائم رکھے ہوئے ہے۔ چڑیاں ہوں یا پرندے، پھول ہوں یا پودے، شبنم کی بوندیں ہوں یا آسمان کی کہکشائیں، یہ سب کچھ محض اتفاق سے وجود میں نہیں آسکتے۔ اس منظم اور بامقصد نظام کو کوئی ایسی قوت ضرور ہے جو تھامے ہوئے ہے اور جس کے حکم کے بغیر کوئی شے حرکت بھی نہیں کر سکتی۔ اقبال اس نقطہ نظر سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ عقل بھی اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہے جس کی خبر مذہب پہلے ہی دے چکا ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک اللہ تعالیٰ وہ خودی مُطلق ہے جو تمام زندہ اشیاء کی خودیوں سے بلند تر اور برتر ہے۔ اس کے اور مخلوقات کے درمیان ایک ناقابلِ عبور فاصلہ ہے اور پوری کائنات اس کے حکم کی تابع فرمان ہے۔ اقبال وضاحت کرتے ہیں کہ سورہ اخلاص میں اسی خودی مطلق کو "اللہ" کے نام سے پکارا گیا ہے، جو ہر طرح کی کمی، نقص، یا محدودیت سے پاک ہے۔ لفظ "اللہ" ایسی ہستی کو ظاہر کرتا ہے جو تذکیر و تانیث، واحد و جمع، ہر قید و وصف سے ماورا اور تمام کمالات کی مالک ہے۔

اقبال مزید بیان کرتے ہیں کہ سورہ اخلاص اللہ تعالیٰ کی انفرادیت کو اس طرح واضح کرتی ہے کہ وہ واحد و یکتا ہے، نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد، یعنی اس کی ذات ایسی کامل اور لاثانی ہے جسے اپنی بقا کے لیے کسی سہارے یا نسل کے تسلسل کی حاجت نہیں۔ وہ ازلی و ابدی ہے، اس کا کوئی شریک یا ہمسر نہیں اور اس کی حقیقت و مثال کائنات کی کسی شے میں نہیں پائی جا سکتی۔ اقبال کے نزدیک یہی تصورِ خودی مُطلق انسان کے فِکر و ایمان کو استحکام دیتا ہے اور اسے اس عظیم حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو اس کی تخلیق کا ماخذ اور اس کے وجود کا مقصد ہے۔ سورہ اخلاص میں مختصر مگر جامع ترین انداز میں خودی مطلق کی خصوصیات کا بیان کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال کے مطابق سورہ اخلاص کا مقصد عیسائی نظریہ تثلیث کا رد نہیں بلکہ خودی مطلق کی انفرادیت کا بیان ہے۔ اسی کو خلیفہ عبدالحکیم اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ:

"سورہ اخلاص کی آیات کا مقصد محض عقیدہ تثلیث کی تردید نہیں بلکہ خدا کے فردِ کامل ہونے کو واضح کرنا ہے۔"(۸)

پروفیسر محمد عثمان ذاتِ باری تعالیٰ کے حوالے سے فکرِ اقبال ہی سے استفہام اخذ کرتے ہیں کہ وہ کیا کائنات میں پھیلی ذات ہے اور اس پر منحصر ہے؟ کیا کائنات میں سے تمام اشیا کا وجود ختم کر دیا جائے تو وہ ذات بھی خاتمے سے دوچار ہو گی؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔

یہاں گہرائی اور گیرائی کے تصورات سے معاملہ کچھ کچھ واضح ہوتا ہے۔ نہ مکمل وجود آخری نقطہ ہے اور نہ ہی محض شہود حتمی بلکہ ان کے بیچ بھی ایک راستہ ہے اور وہ یہ کہ ہر شے کی اصل روحانی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے رواں ہے۔ پروفیسر محمد عثمان یوں بیان کرتے ہیں۔

> "حقیقتِ مطلقہ کے بارے میں انسان کس قسم کا تصور قائم کرے؟ کیا خدا کی ذاتِ پاک اپنی بے مثال "انفرادیت" رکھتی ہے یا وہ ایک ذاتِ بسیط ولاصورت ہے جو پوری کائنات میں پھیلی ہوئی ہے؟"(۹)

اقبال کے مطابق، حقیقت مطلق کی فطرت کو سمجھنے کے لیے یا تو ظاہری دنیا کے حسی مشاہدے کے ذریعے یا نفس کے ساتھ باطنی تعلق کے ذریعے گہری مشغولیت کی ضرورت ہوتی ہے، جسے قرآن میں اکثر "دل" کہا گیا ہے۔ یہ باطن سطحی ظہور سے بالاتر اعلیٰ سچائی کو سمجھنے کے لیے ایک گیٹ وے کا کام کرتا ہے۔ دعا، اس تناظر میں، اس اہم اندرونی ربط کی علامت ہے، عبادت کے ایک ذریعہ کے طور پر کام کرتی ہے جو روح کو الٰہی کے ساتھ جوڑتی ہے۔ اقبال نے "نماز" کی اصطلاح کا استعمال اس بات کو اجاگر کرنے کے لیے کیا کہ عبادت صرف رسمی رسومات تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں تمام قسم کی مخلصانہ عقیدت اور روحانی نظم شامل ہے۔ بالآخر، اقبال کے نزدیک، سچی عبادت میں ایک جامع نقطہ نظر شامل ہوتا ہے۔ جس میں ظاہری اعمال اور اندرونی شعور دونوں کو اپنانا ہوتا ہے۔ جو الٰہی حقیقت کے گہرے ادراک کی طرف لے جاتا ہے۔

اسلام میں اجتماعی عبادت کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ نماز ہو یا روزہ، زکوٰۃ کی ادائیگی ہو یا حج کی عظیم عبادت، ہر عمل میں مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور انہیں ایک متحدہ اُمت کی صورت میں ڈھالنے کی حکمت کارفرما ہے۔ یہ اجتماعی عبادات نہ صرف روحانی بالیدگی کا ذریعہ بنتی ہیں بل کہ مسلمانوں کے درمیان بھائی چارے، ہمدردی، اور باہمی تعاون کے جذبات کو بھی پروان چڑھاتی ہیں۔ اسلام کا نظامِ عبادت فرد کی ذاتی نجات تک محدود نہیں، بلکہ وہ اجتماعی فلاح و بہبود اور اُمت کے اتحاد کو اولین حیثیت دیتا ہے۔ اس طرح اسلام انفرادی مفاد سے بڑھ کر اجتماعی زندگی کو ترجیح دیتا ہے تاکہ ایک ایسا معاشرہ تشکیل پا سکے جو ایمان، محبت اور خدمت کے رشتوں سے جڑا ہوا ہو اور جس میں ہر فرد دوسرے کی قوت بن کر کھڑا ہو۔

اسلام اجتماعی زندگی کی اہمیت پر زور دیتا ہے، اسے مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے ضروری سمجھتا ہے۔ قرآن کی تعلیمات اور پیغمبر محمد ﷺ کی روایات کی رہنمائی میں مومنین کو بھائی چارے اور باہمی تعاون کے مضبوط بندھن کو فروغ دینے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ باقاعدہ نماز، اجتماعی جمعہ کی نماز، عید اور حج کے دوران خصوصی اجتماعات سماجی اور ثقافتی حدود سے بالاتر ہو کر متنوع پس منظر سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو متحد کرنے کا کام کرتے ہیں۔ یہ طرز عمل اسلام کے مساوات، اخوت اور عالمگیر بھائی چارے کے بنیادی اصولوں کی مثال دیتے ہیں۔ وہ اسلام کے حقیقی جوہر کو ایک ایسے عقیدے کے طور پر اجاگر کرتے ہیں جو تمام مومنین کے درمیان اتحاد، ہمدردی اور مشترکہ مقصد کو فروغ دیتا ہے، دنیا بھر میں ایک ہم آہنگ اور ہم آہنگ مسلم کمیونٹی کو فروغ دیتا ہے۔

علامہ اقبال نے اپنے تیسرے خطبے بعنوان "تصورِ خدا اور حقیقتِ دعا" میں اجتماعی عبادات اور دعا کی اہمیت پر خصوصی طور پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے وضاحت کی ہے کہ اجتماعی دعا اور عبادت نہ صرف روحانی تقویت کا ذریعہ ہیں بلکہ مسلمانوں کے درمیان اتحاد، باہمی محبت، اور اخوت کو فروغ دینے میں بھی بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک اجتماعی عبادات انسان کو اس کی انفرادی کمزوریوں سے نکال کر ایک مضبوط اجتماعی شعور عطا کرتی ہیں، جس کے نتیجے میں فرد خود کو ایک بڑی روحانی اور اخلاقی طاقت کا حصہ محسوس کرتا ہے۔ محمد شریف بقا لکھتے ہیں:

> "دُعا کا حقیقی مقصد اُس وقت حاصل ہوتا ہے جب دُعا کا عمل اجتماعیت کا حامل ہو۔ تمام حقیقی عبادات کی رُوح اجتماعیت پر مبنی ہوتی ہے۔"(۱۰)

دعا انسان کو خدا کے قریب لانے کا سب سے مؤثر اور اہم ذریعہ ہیں۔ فرد کی سطح پر، یہ روحانی سکون، قلبی اطمینان اور ذہنی صفائی کا باعث بنتی ہیں، جس سے انسان اپنی کمزوریوں اور برائیوں سے خود آگاہ ہوتا اور اصلاح کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اجتماعی سطح پر، عبادت مثلاً نماز جماعت اور اجتماعی دعائیں، سماجی اتحاد، بھائی چارہ اور اخلاقی ہم آہنگی کو فروغ دیتی ہیں، کیوں کہ انسان ایک مشترکہ روحانی تجربے کا حصہ بن کر دوسروں کے ساتھ ہم دردی اور تعاون سیکھتا ہے۔ دعا اور عبادت نہ صرف انسان کو روحانی بلندی عطا کرتی ہیں بل کہ اس کے کردار میں نیکی، صبر، شکر گزاری اور عدل کے اصول کو بھی مضبوط کرتی ہیں، جس سے فرد اور معاشرہ دونوں کی فلاح و بہبود ممکن ہوتی ہے۔ یہ انسانی زندگی میں رہنمائی، استقامت اور خدا پر اعتماد کی بنیاد فراہم کرتی دعا یا عبادت قرب خداوندی کا واحد ذریعہ ہے۔ دعا و عبادت کے انفرادی و اجتماعی فوائد کا ذکر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد آصف اعوان فکر اقبال کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "اقبال کے خیال میں عبادت کے وصل الٰہی ہونے میں کوئی ایسی اسراریت نہیں ہے کہ جس کو سمجھا نہ جا سکے۔ صوفیائے کرام کی زندگیاں اس بات پر گواہ ہیں کہ عبادت روحانی طور پر کسب انوار الٰہی کا ایک عام ذریعہ رہی ہے۔"(۱۱)

شاعر مشرق علامہ اقبالؒ اپنے فکر و فلسفہ میں فرد کی تربیت اور خودی کی مضبوطی پر زور دیتے ہیں، لیکن ساتھ ہی وہ اس بات کو بھی واضح کرتے ہیں کہ فرد کی حقیقی تکمیل اسی وقت ممکن ہے جب وہ اپنی صلاحیتوں کو اجتماعی اور ملّی مفاد کے لیے استعمال کرے۔ ان کے نزدیک فرد کی خودی کا عروج اسی وقت بامعنی بنتا ہے جب وہ اپنی ذات سے نکل کر قوم، ملت اور انسانیت کی فلاح کے لیے کردار ادا کرے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں(۱۲)

یہ شعر انسان کی اجتماعی زندگی اور فرد کی اجتماعی وابستگی کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ فرد اپنی اصل پہچان اور قوت صرف اس وقت حاصل کر سکتا ہے جب وہ اپنی اُمت یا جماعت کے ساتھ مربوط ہو؛ تنہا انسان بے اثر اور کمزور ہے۔ جیسے دریا کی موج اپنے وجود کا شعور دریا کی وسعت میں پاتی ہے اور دریا سے الگ ہو کر کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اسی طرح فرد کی فلاح اور اثر پذیری

اس کی اجتماعی وابستگی سے مشروط ہے۔ یہ شعر ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ انسان کی ترقی، اثر ورسوخ اور مقام صرف اجتماعی ہم آہنگی، تعاون اور ملت سے جڑنے سے ممکن ہے، اور فردی خود غرضی یا تنہائی انسان کو نفع نہیں پہنچاتی۔ ایک مقام پر خطبات میں اقبال لکھتے ہیں:

> " اگر ہم چاہتے ہیں کہ عبادت اپنے حقیقی مقصد اور اثر میں مکمل طور پر کامیاب ہو، تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے اجتماعی شکل دی جائے۔ ان کے نزدیک عبادت جب خلوص، سچائی اور اخلاص سے کی جائے تو اس کی روح خود بخود اجتماعی بن جاتی ہے، کیوں کہ سچی عبادت انسان کو محض اپنے رب سے ہی نہیں جوڑتی بلکہ اسے اپنے معاشرے، امت اور انسانیت کے ساتھ بھی جوڑتی ہے۔ یوں اجتماعی عبادت فرد کے دل میں محبت، اتحاد اور خدمت کا جذبہ بیدار کر کے اسے ایک ذمہ دار اور بامقصد انسان بناتی ہے۔"(۱۳)

اسلامی معاشرے میں شروع سے ہی صلوٰۃ باجماعت پر خصوصی زور دیا گیا ہے تاکہ فرد کی عبادت محض ذاتی روحانی تجربات، مراقبات یا ذکر و فکر تک محدود نہ رہ جائے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ اگر عبادت کا عمل صرف انفرادی گوشہ نشینی تک محدود ہو جائے تو اس سے اجتماعی مفادات اور جماعت کی ضروریات متاثر ہو سکتی ہیں۔ باجماعت نماز اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ فرد کا روحانی سفر اس کے سماجی کردار اور امت کے اجتماعی شعور سے جڑا رہے، تاکہ دین کا نظام عبادت و اجتماعیت دونوں پہلوؤں سے متوازن اور مضبوط رہے۔ اقبال گزشتہ بحث کو اس نہج پر لاتے ہیں:

> "اسلام میں، اجتماعی نماز وحدت کی علامت کے طور پر گہری اہمیت رکھتی ہے، نسل، سماجی حیثیت، اور قومیت جیسے انسانی امتیازات سے بالاتر ہے۔ یہ امت کے ارکان کے طور پر ہماری موروثی وحدت کی عکاسی کرتا ہے، بھائی چارے اور مشترکہ مقصد کے احساس کو فروغ دیتا ہے۔ یہ اجتماعی عمل نہ صرف روحانی بندھنوں کو مضبوط کرتا ہے بل کہ برادری، باہمی تعاون اور اجتماعی علم کی اہمیت پر بھی زور دیتا ہے۔"(۱۴)

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ چوں کہ ہم انسان فکر و نظر کے حوالے سے بہت سی جگہوں پر اس قدر محدود ہیں کہ اپنے حواسِ ظاہری اور تجربات کی روشنی میں ہر شے کو جانچنا چاہتے ہیں اسی لیے ذاتِ باری تعالیٰ کو بھی دنیاوی پیمانوں کے مطابق جانچتے ہوئے خطا اٹھاتے ہیں۔ وہ احد ہے اور ایسا احد ہے کہ اسے اپنے بقا کے لیے کسی (Reproduction) بیرونی سہارے کی ضرورت نہیں۔ علامہ اقبال نے برگساں کی فکر کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "Individuality is a matter of degrees and is not fully realized even in the case of the apparently closed off unity of the human being"(۱۵)

مندرجہ بالا بیان انسانی انفرادیت کی پیچیدگی اور اس کی حد بندی کو واضح کرتا ہے۔ اس کے مطابق، انسان کی فردیت مکمل طور پر حاصل شدہ تصور نہیں ہے بلکہ ایک نسبتی اور تدریجی عمل ہے۔ حتیٰ کہ وہ شخص جو بظاہر خود میں مکمل اور مکمل طور پر ایک واحد شخصیت کے طور پر نظر آتا ہے، بھی حقیقت میں مختلف پہلوؤں، جذبات اور تعلقات کے ذریعے اجتماعی اور بیرونی دنیا سے جڑا ہوا ہے۔ انسانی وجود میں یہ اندرونی تضاد اور مختلفیت ہمیشہ موجود رہتی ہے، جو فرد کی ترقی اور خود شناسی کے عمل کو متحرک رکھتی ہے۔ یوں، فردیت کو سمجھنا صرف خود پسندی یا الگ تھلگ ہونے کا مسئلہ نہیں بلکہ انسانی تعلقات، تجربات اور معاشرتی وابستگیوں کے تناظر میں اس کی تدریجی تکمیل کا معاملہ ہے۔ علامہ اقبال ہی کی فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے سید وحید الدین تحریر کرتے ہیں کہ دراصل یہ بحث وجودِ باری تعالیٰ کے تصور کی نوعیت کی ہے۔

> "اسلامی توحید یا وحدانیت جو خدا کے "لم یلد ولم یولد" ہونے پر اتنا اصرار کرتی ہے اس میں ایک لطیف نکتہ مضمر ہے یہاں اقبال برگساں کے خیالات سے اتفاق کرتے ہیں اور اس مفکر کے حوالے سے اس حقیقت کی طرف نشاندہی کرتے ہیں کے تولید و تناسل کا عمل اور انفرادیت اور فرد کی فردیت ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔"(۱۶)

یعنی اللہ تعالیٰ کی اس صفتِ کمال کی کوئی مثال انسانی ارتقا یا مخلوق کی کسی خصوصیت سے پیش نہیں کی جاسکتی۔ قرآن مجید نے جو بار بار اللہ تعالیٰ کی یکتائی، انفرادیت اور احدیت پر زور دیا ہے، اس کا مقصد صرف عیسائیت کے عقیدۂ تثلیث کی تردید کرنا نہیں، بل کہ اس سے بڑھ کر یہ حقیقت واضح کرنا ہے کہ اللہ کی ذات ہر طرح کی تشبیہ، مثال اور انسانی تصور کی حدود سے ماورا ہے۔ وہ کامل ترین ہستی ہے جس کا کوئی شریک، کوئی مثل اور کوئی نظیر نہیں اور اسی تصورِ توحید میں انسان کے ایمان کی اصل بنیاد اور اس کی فکری و روحانی آزادی کا راز پوشیدہ ہے۔ لکھتے ہیں:

> "نیت کاملہ کی یہی خصوصیت ذاتِ الٰہیہ کے اس تصور کا بنیادی جزو ہے جو قرآن پاک کو اس وقت کے مروجہ عیسائیت مسیحی عقیدے کی تردید منظور تھی بل کہ اس لیے کہ فرد کامل کے ٹھیک ٹھیک تصور میں کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے۔"(۱۷)

نیتِ کاملہ کا تصور دراصل اسی قرآنی فکر کا نچوڑ ہے جس کے ذریعے ذاتِ الٰہیہ کی یکتائی، خالص توحیدی شعور اور عبد و معبود کے غیر مشتبہ تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔ قرآنِ حکیم نے اُس زمانے کے رائج مسیحی عقائد کی تردید اسی لیے کی کہ الوہیت اور بشریت کے باہمی امتزاج کے باعث جو فکری التباس پیدا ہوا تھا، وہ انسانِ کامل کے حقیقی مفہوم کو مسخ کر رہا تھا۔ چناں چہ نیتِ کاملہ اُس پاکیزہ داخلی روشنی کا نام ہے جس میں بندہ اپنی تمام تر وابستگی، توجہ، خشوع اور اطاعت کو بلاشرکتِ غیرے خدا کی طرف مرکوز کرتا ہے۔ یہی خالص نیت فردِ کامل کے تصور کو ہر طرح کے ظن و تخمین سے پاک کرتی ہے اور انسان کو اس درجۂ یقین تک پہنچاتی ہے جہاں اُس کی فکر میں توحید کا نور بھی کامل ہو جاتا ہے اور اس کا کردار بھی۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو نیتِ کاملہ صرف ایک اخلاقی قدر نہیں، بلکہ اُس توحیدی نظامِ فکر کی بنیاد ہے جو قرآن انسان کو دینا چاہتا ہے۔

"اللہ نورالسموات والارض۔(سورۃ نور، ۲۴:۵۳۲)

آیتِ مبارکہ "اللّٰہُ نُورُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ "ایک ایسی ہمہ گیر اور عمیق حقیقت کو بیان کرتی ہے جس میں کائنات کی باطنی بنیاد، اس کی روحانی سمت اور انسان کے وجودی شعور، سب ایک ہی مرکز پر آکر جمع ہو جاتے ہیں۔ یہاں "نور" سے مراد صرف ظاہری روشنی نہیں، بل کہ وہ ازلی وابدی ہدایت، علم، قوتِ تخلیق اور حق جلّ مجدہ کا احاطہ کرنے والی وہ الوہی تجلی ہے جو ہر شے کی حقیقت کو منور کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور اس معنی میں ہے کہ تمام کائناتی نظام، فطری قوانین، انسانی شعور اور اخلاقی بصیرت اسی نورِ واحد سے فیض پاتے ہیں۔ یہ نور نہ صرف مخلوقات کی رہنمائی کرتا ہے بل کہ حق اور باطل، ہدایت اور گمراہی کے درمیان امتیاز کی صلاحیت بھی اسی سے جنم لیتی ہے۔ اس آیت کا مفہوم یہ بھی ہے کہ وجودِ کائنات کی اصل حقیقت اور اس کا قائم رہنا ایک ایسے ربّ کی تجلی سے وابستہ ہے جس کا نور ہر طرف محیط ہے، مگر انسانی دل اسی وقت اس نور سے منور ہوتا ہے جب وہ اخلاص، ایمان اور طہارتِ باطن کے ذریعے اپنے آپ کو اس کے قابل بنائے۔ یوں یہ آیت نہ صرف کائناتی حقیقت کا اعلان ہے بل کہ انسان کے روحانی سفر کی سمت اور بنیاد بھی فراہم کرتی ہے۔

تاہم، قرآن مجید میں جب اللہ تعالیٰ کو "نور" کہا گیا ہے تو اس سے مراد محض طبیعی روشنی نہیں بل کہ وہ ہدایت، حقیقت اور وہ لامحدود اور لازوال ذات ہے جو تمام کائنات کو وجود، معنی، اور مقصد عطا کرتی ہے۔ اس کا نور ہر چیز پر محیط ہے، لیکن وہ خود مخلوقات کی طرح کسی طبیعی حقیقت تک محدود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت کی مکمل تفہیم کے لیے محض لفظی ترجمے پر اکتفا کرنا کافی نہیں بل کہ اس کے عمیق معنوی اور روحانی پہلوؤں کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر طرح کے عیوب اور نقائص سے پاک ہے۔ اگرچہ روشنی ایک مخلوق ہے، لیکن اس کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جو اسے دیگر دنیاوی اشیاء سے ممتاز کرتی ہیں، مثلاً یہ کہ روشنی کی شدت ہر سمت میں یکساں رہتی ہے اور اسے پھیلنے کے لیے کسی دوسرے وسیلے یا مادّی ذریعہ (Medium) کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اسی لیے اگر مذکورہ آیت کا مفہوم اس طرح سمجھا جائے کہ اللہ تعالیٰ زمین وآسمان کو منور کرنے والا ہے تو یہ تعبیر زیادہ مناسب محسوس ہوتی ہے، کیوں کہ اس میں اللہ کی قدرت اور اس کی نورانیت کا وہ مفہوم شامل ہے جو مخلوقات کی مادی حدود سے بالاتر ہے۔ سید وحید الدین اس کی وضاحت یوں پیش کرتے ہیں۔

> "قرآن میں خدا کو نور سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن اس سے ہمہ اوست کے نظریے کی تائید نہیں ہوتی بلکہ خدا کی فرضیت ثابت ہوتی ہے۔ حال کی طبیعیاتی تحقیقات کے تحت یہ کہا جاسکتا ہے کہ نُور کی تشبیہ خدا کی حضوری کو نہیں بلکہ خدا کی مطلقیت کو ظاہر کرتی ہے۔"(18)

روایتی، دلی انداز میں، اجتماعی دعا ایک طاقتور اتپریرک Catalyst کے طور پر کام کرتی ہے جو شرکا کے درمیان جذباتی تعلق کو بڑھاتی ہے۔ یہ ہمدردی، متاثر کن انقلابی خیالات اور اجتماعی کوششوں کو فروغ دیتا ہے جس کا مقصد مثبت سماجی تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ اس طرح کے مشترکہ روحانی تجربات ایک فرد کی الٰہی سے قربت کو گہرا کرتے ہیں، علامہ اقبال کی تعلیمات کی بازگشت، جنہوں نے روحانی

اتحاد کی اہمیت پر زور دیا۔ عقیدت کی ان اجتماعی کارروائیوں کے ذریعے، افراد کو سکون اور اندرونی طاقت ملتی ہے، اپنے اندر امن کو فروغ دیتے ہیں اور انہیں پوری انسانیت کی بہتری کے لیے انصاف اور ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

قرآن ہمیں خوبصورتی سے یاد دلاتا ہے کہ "ہم ایک شخص کے اس کی رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں،" ہماری زندگیوں میں خدا کی قریبی موجودگی پر زور دیتا ہے۔ مشکل اور جدوجہد کے وقت، یہ گہرا سچ ایک تسلی بخش یاد دہانی کا کام کرتا ہے کہ ہم کبھی بھی واقعی تنہا نہیں ہوتے۔ خدا کی قربت کو پہچاننا ہمیں صبر، لچک اور خود مختاری پیدا کرنے کی ترغیب دیتا ہے، جو ہمیں غیر متزلزل حوصلے کے ساتھ چیلنجوں کا مقابلہ کرنے میں مدد کرتا ہے۔ مایوسی کا شکار ہونے کے بجائے، جو صرف تاریکی کو گہرا کرتا ہے اور بے عملی کی طرف لے جاتا ہے، دعا اور دعا کی طرف رجوع کرنا امید اور یقین کے دروازے کھولتا ہے۔ دعا کے ذریعے، ہم خدا کے لامحدود فضل سے دوبارہ جڑ جاتے ہیں، جو ہمارے اندرونی عزم کو مضبوط کرتا ہے اور ہمارے خود اعتمادی کو بڑھاتا ہے۔ یہ روحانی تعلق ہمیں مشکلات میں ثابت قدم رہنے، خوشی اور امن کے احساس کو انتہائی مشکل حالات میں بھی تقویت دیتا ہے۔ بالآخر، خدا کی قربت ہمیں اس کی رحمت اور رہنمائی پر بھروسہ کرتے ہوئے ثابت قدم اور پر امید رہنے کی ترغیب دیتی ہے۔

> "اقبال نے فصاحت کے ساتھ کہا کہ خدا ہم سب سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ خدا ہماری مخلصانہ دعاؤں کو سنتا ہے اور ہماری زندگیوں میں سرگرم عمل ہے۔ اقبال نے اس بات پر روشنی ڈالی کہ زندگی خود خدا کی موجودگی کا عکس ہے، جو ہمیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ گہرا روحانی تعلق حاصل کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔"(۱۹)

نماز، یا عبادت کو ایک فطری انسانی رجحان کے طور پر دیکھتا ہے جو ہمارے وجود کے بنیادی حصے سے پھوٹتا ہے۔ وہ مشہور فلسفی اور ماہر نفسیات ولیم جیمز کے ساتھ متوازی ہے، جس نے اس بات پر زور دیا کہ نماز محض ایک رسم یا ثقافتی نمونہ نہیں ہے بلکہ انسانی فطرت کا ایک بنیادی پہلو ہے۔ اقبال کے مطابق، یہ روحانی خواہش ہمارے اندر بہت گہرائی سے پیوست ہے اور وقت اور ثقافتوں میں لچکدار رہتی ہے۔ جب تک ہماری ذہنی اور روحانی ساخت میں گہرا تبدیلی نہ آئے اس کے ختم ہونے یا ختم ہونے کا امکان نہیں ہے۔ اس طرح کی تبدیلی کے لیے ایک بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہوگی کہ ہم اپنے آپ کو اور کائنات میں اپنے مقام کو کیسے سمجھتے ہیں، جو کچھ نایاب اور گہرا ہے۔

اپنے خطبات میں، اقبال نماز کی پائیدار نوعیت کو اجاگر کرنے کے لیے اکثر اپنے کام، "مذہبی تجربے کی اقسام" کا حوالہ دیتے ہیں۔ وہ زور دے کر کہتا ہے کہ جب تک دنیا موجود ہے، انسان دعا کے ذریعے الٰہی سے تعلق تلاش کرتا رہے گا۔ یہ مستقل عمل مادی دائرے سے باہر معنی، سکون اور صحبت تلاش کرنے کی فطری خواہش سے پیدا ہوتا ہے۔ انفرادی خود مختاری کی سطح کے نیچے، اقبال بتاتے ہیں، ایک اجتماعی خودی پنہاں ہے – ایک خدائی موجودگی کی مشترکہ لاشعوری خواہش۔ یہ آرزو ایک الٰہی ساتھی کی خواہش کے طور پر ظاہر ہوتی ہے، جو زندگی کی ناگزیر مشکلات اور غیر یقینی صورتحال کے درمیان سکون فراہم کرتا ہے۔ اس طرح کی الٰہی صحبت نبی محمدؐ کی

تعلیمات کی یاد دلاتی ہے، جنہوں نے خدا کو "اعلیٰ ترین ساتھی" کے طور پر بیان کیا، ایک مستقل اور محبت بھری موجودگی جو رہنمائی اور برقرار رکھتی ہے۔

> "بہت سے لوگ، خواہ دانستہ طور پر اس سے واقف ہوں یا نہ ہوں، اس تڑپ کو اپنے دلوں میں رکھتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی سطح پر محسوس کرتے ہیں کہ ایک اعلیٰ ہستی ان کے اعمال کا مشاہدہ کرتی ہے، انہیں اندرونی طاقت اور یقین دہانی فراہم کرتی ہے۔ یہ آگاہی ان کی جدوجہد اور امیدوں کو معنی دیتی ہے، افراتفری کے درمیان مقصد کا احساس پیش کرتی ہے۔ اس احساس کی شدت افراد میں مختلف ہوتی ہے، اکثر مذہب اور روحانی عقائد سے ان کی ذاتی لگاؤ پر منحصر ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں کے لیے یہ ایک گہرا اور اٹل تعلق ہے۔ دوسروں کے لیے، زیادہ لطیف، لاشعوری جھکاؤ۔ بہر حال، اقبال اس بات پر زور دیتے ہیں کہ الٰہی میل جول کی یہ عالمگیر خواہش انسانی فطرت کا ایک اندرونی پہلو ہے، جس میں ثقافتوں اور تہذیبوں میں نماز کے لازوال عمل کی بنیاد ہے۔"(۲۰)

ایک روایتی اور تعظیمی انداز میں، جیمز اس بات پر زور دیتا ہے کہ دعا مومنوں کے لیے ایک ناگزیر عمل ہے، جو خدا کی قبولیت اور پسندیدگی کے لیے مخلصانہ خواہش پیدا کرنے کے ایک اہم ذریعہ کے طور پر کام کرتی ہے۔ وہ قرآن کے اس یقین دہانی کے وعدے کا حوالہ دے کر اس نظریے کی تائید کرتا ہے: "مجھ سے دعا کرو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا،" جو مخلصانہ دعا سننے اور اس کا جواب دینے کے لیے الٰہی رضامندی کو نمایاں کرتا ہے۔ اقبال اور جیمز دونوں دعا کو محض الفاظ سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ یہ ایک گہری نفسیاتی حقیقت ہے جو انسانی روح کو گہرائی سے چھوتی ہے، لوگوں کو ان کی اندرونی خواہشات، امیدوں اور امنگوں کا اظہار کرنے میں مدد کرتی ہے۔ عبادت، اس تناظر میں، نہ صرف عقیدت کا ایک عمل ہے بل کہ ایک صالح فرض بھی ہے جو روح کو بلند کرتا ہے اور اسے الٰہی مرضی کے ساتھ ہم آہنگ کرتا ہے۔ دعا اور عبادت کے ذریعے، مومنین روحانی تکمیل اور الٰہی موجودگی کے ساتھ تعلق کا احساس پاتے ہیں جو ان کے ایمان کے سفر پر انہیں برقرار اور رہنمائی کرتی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد عارف خان لکھتے ہیں:

> "عبادت و دعا ہر مذہب میں موجود ہے۔ طریق کار مختلف ہو سکتا ہے اور علامہ نے عبادت کے مختلف طریق کار کو عبادت کی روح سے جوڑا ہے۔ عبادت کا تعلق ہر مذہب میں ذات الٰہیہ سے ہے نہ کہ مغرب و مشرق کی طرف منہ کرنے سے۔"(۲۱)

اقبال اس نکتے کی نہایت حکیمانہ توضیح کرتے ہیں کہ عبادت کے دوران ایک مخصوص سمت کی تعیین محض رسماً اختیار کردہ طریقہ نہیں بلکہ انسانی باطن میں وحدت، برابری اور یکجہتی کے احساس کو بیدار کرنے کا مؤثر وسیلہ ہے۔ انسان کے جسمانی رُخ کا اس کے احساسات اور باطنی کیفیت پر گہرا اثر پڑتا ہے؛ اسی لیے اسلام نے تمام مسلمانوں کے لیے ایک ہی سمت مقرر کی، تاکہ عبادت کے لمحوں میں ہر فرد اپنے طبقاتی، نسلی، معاشرتی اور معاشی تفاوت کو پس پشت ڈال کر یکساں طور پر ایک مرکز سے وابستہ ہو جائے۔ صفِ نماز میں

سب کا شانہ بشانہ کھڑا ہونا عملاً اس حقیقت کا اعلان ہے کہ انسانوں کی اصل قدر ان کے مقام و منصب میں نہیں بلکہ ان کے انسان ہونے میں مضمر ہے۔ اقبال اس مثال کے ذریعے واضح کرتے ہیں کہ جب ایک متکبر اور امتیازات کے عادی شخص کو بارہا اس تجربے سے گزرنا پڑے کہ وہ اپنے سے کمتر سمجھے جانے والے فرد کے ساتھ برابری کی بنیاد پر کھڑا ہے، تو اس کے ذہنی و روحانی زاویے بدل سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اقبال اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ تمام انسان دراصل ایک وحدتِ کُلی کے اجزا ہیں۔ اس ازلی و ابدی ہستی کے جلوے جو پوری کائنات کو تخلیق بھی کرتی ہے اور اسے ربطِ باہمی کے بندھن میں باندھے بھی رکھتی ہے۔ یوں نماز کی یہ ظاہری ترتیب انسان کو اس بات کا شعور دیتی ہے کہ وہ اکیلا نہیں بلکہ ایک وسیع، ہمہ گیر اور خدائی وحدت کا حصہ ہے۔

> "وہ اس بارے میں بات کرتا ہے کہ لوگ ایک خاص سمت کی طرف منہ کر کے دعا کیوں کرتے ہیں۔ وہ بتاتا ہے کہ آپ اپنے جسم کو کس طرح پوزیشن میں رکھتے ہیں اس پر اثر انداز ہو سکتا ہے کہ آپ کے اندر کیسا محسوس ہوتا ہے۔ لہٰذا، اسلام نے ہر ایک کے لیے ایک مخصوص سمت کا انتخاب کیا جب وہ نماز پڑھتے ہیں تاکہ سب ایک جیسا اور برابر محسوس کریں۔ جب لوگ نماز کے لیے اکٹھے کھڑے ہوتے ہیں، تو اس سے ان اختلافات کو بھولنے میں مدد ملتی ہے جیسے کہ کوئی امیر ہے یا غریب، یا اس کا پس منظر۔ مثال کے طور پر، اگر جنوبی ہندوستان کا ایک بہت ہی قابل فخر شخص ہر روز کسی ایسے شخص کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے جسے کمتر سمجھا جاتا ہے، تو اس سے ہر ایک کو یہ دیکھنے میں مدد ملے گی کہ تمام لوگ برابر ہیں۔ اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ تمام انسان ایک بڑی، خاص ہستی کا حصہ ہیں، جو ہر چیز کا خالق ہے اور ہم سب کو جوڑتا ہے۔"(۲۲)

اقبال کا خیال ہے کہ علم سیکھنا اور حاصل کرنا خدا سے دعا یا بات کرنے جیسا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کائنات ہمیشہ بڑھ رہی ہے اور بڑی ہو رہی ہے۔ اس لیے وہ سوچتا ہے کہ لوگوں کو مل کر دعا کرنی چاہیے، کیوں کہ ایسا کرنے سے ان کے احساسات اور سمجھ مضبوط اور حقیقی ہو جاتی ہے۔ جب بہت سے لوگ اکٹھے دعا کرتے ہیں، تو وہ چیزوں کو اس وقت سے بہتر دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں جب وہ اکیلے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی خود سے سب کچھ کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو وہ اتنی طاقت یا حوصلہ افزائی نہیں کر سکے گا۔ اقبال یہ بھی سوچتے ہیں کہ فطرت اور اپنے ارد گرد کی دنیا کا مطالعہ بہت ضروری ہے، ایک ایسا سفر جو ہمیں اپنے اور کائنات کے بارے میں جاننے میں مدد کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سائنس اور دعا دونوں مل کر ایک مضبوط، اچھے معاشرے کی تعمیر کے لیے کام کر سکتے ہیں جو طویل عرصے تک قائم رہے۔ لیکن ان کا خیال ہے کہ جدید مغربی تہذیب سائنس اور نماز دونوں کی اہمیت کو نظر انداز کر کے بہت بڑی غلطی کر رہی ہے۔ اقبال کے نزدیک ان دونوں چیزوں کو نہ ملا کر وہ خود کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

اقبال اپنی بصیرت افروز گفتگو میں بامعنی انسانی ترقی کے حصول کے لیے روحانی اور سماجی دونوں جہتوں کو یکجا کرنے کی اہم اہمیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ حقیقی ترقی صرف مادی ترقی سے نہیں ہو سکتی۔ اس کے بجائے، یہ اندرونی روحانی ترقی اور ظاہری سماجی ہم آہنگی کے درمیان ایک ہم آہنگ توازن کی ضرورت ہے۔ اقبال مزید اس بات پر زور دیتے ہیں کہ نفسیات کے

شعبے نے ابھی تک ان بنیادی قوانین کو مکمل طور پر دریافت کرنا ہے جو اجتماعی انسانی شعور کو بلند کر سکتے ہیں اور متنوع برادریوں کے درمیان اتحاد کے احساس کو فروغ دے سکتے ہیں۔

> "اپنے تیسرے خطبہ میں وہ اس اجتماعی روحانی بیداری کی پرورش میں اسلام کے گہرے کردار کو خاص طور پر اجاگر کرتے ہیں۔ انہوں نے حج کی مقدس زیارت کو اسلام کے اتحاد اور یکجہتی پر زور دینے کی ایک طاقتور علامت کے طور پر اشارہ کیا۔ عبادت اور مشترکہ رسومات کے ذریعے، حج اس بات کی مثال دیتا ہے کہ کس طرح عقیدہ مومنین کے درمیان رشتوں کو مضبوط بنا سکتا ہے، اتحاد کے احساس کو فروغ دیتا ہے جو انفرادی اختلافات سے بالاتر ہے اور سماجی ہم آہنگی کو تحریک دیتا ہے۔"(۲۳)

علامہ اقبال کے نزدیک انسانی ترقی کا حقیقی مفہوم اس وقت تک پورا نہیں ہوتا جب تک روحانی بالیدگی اور سماجی ہم آہنگی کو ایک وحدتِ کاملہ میں نہ ڈھالا جائے۔ وہ اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ مادی ارتقا اپنی جگہ اہم ہے، مگر محض مادی قوت انسان کو نہ تو معنوی رفعت عطا کر سکتی ہے اور نہ ہی اجتماعی زندگی میں وہ توازن پیدا کر سکتی ہے جو ایک صالح تہذیب کی بنیاد بنتا ہے۔ اقبال کے مطابق داخلی تزکیہ، ایمان کی حرارت، اور روحانی شعور وہ عناصر ہیں جو فرد کی شخصیت کو نکھارتے اور اسے معاشرے کی تعمیر میں مثبت کردار ادا کرنے کے قابل بناتے ہیں۔ اسی طرح، وہ نفسیات کے اس خلا کی نشاندہی کرتے ہیں جس نے ابھی تک ان قوانینِ فطرت کو پوری طرح منکشف نہیں کیا جو انسانی شعور کو بلند سطح پر متحد کر سکتے ہیں۔ اپنے تیسرے خطبے میں اقبال اسلام کے اس روحانی و اجتماعی نظام کو اجاگر کرتے ہیں جو دلوں کو جوڑ کر ایک ہم مقصد، ہم آہنگ اور باہمی احترام پر مبنی معاشرہ تشکیل دیتا ہے۔ حج کی عبادت ان کے نزدیک اس وحدتِ اُمت کی عملی ترین علامت ہے، جہاں رنگ، نسل، زبان اور قومیت کی تمام حدیں مٹ جاتی ہیں، اور انسانیت ایک روحانی اخوت کے رشتے میں بندھ جاتی ہے۔ یوں اقبال کے فکر میں حج نہ صرف ایک دینی فریضہ ہے بلکہ وہ نمونہ ہے جس کے ذریعے انسان اپنے اندر اتحاد، یکجہتی اور عظمتِ کردار کی روح کو زندہ رکھ سکتا ہے۔ بہر حال اقبال کا موقف یہ ہے کہ اس آیت کا ایک حصہ نہیں بلکہ پورا پڑھا جائے تاکہ معاملے کی وضاحت ہو۔ بقول ڈاکٹر محمد آصف اعوان:

> "عبادت سے قرب اور وصل الٰہی کی ہی بدولت۔۔۔ زبان سے "سبحانی ما اعظم شانی"
> اور "انا الحق" جیسے الفاظ سرزد ہو جاتے ہیں۔"(۲۴)

عبادت کے ذریعے پیدا ہونے والا قربِ الٰہی محض ظاہری عمل کا نتیجہ نہیں ہوتا، بلکہ یہ ایک ایسی باطنی کیفیت ہے جس میں انسان کی روح اپنے ربّ کے نور سے اس قدر منور ہو جاتی ہے کہ اس کے احساسات، خیالات اور وارداتِ قلبی عام انسانی تجربے سے ماورا ہو جاتے ہیں۔ جب بندہ ذکر، ریاضت، خشوع اور خلوصِ نیت کے ذریعے مسلسل اللہ کی طرف متوجہ رہتا ہے تو اس کی ذات میں ایک لطیف روحانی انقلاب برپا ہوتا ہے۔ یہی کیفیت بعض اوقات اس حد تک شدت اختیار کر لیتی ہے کہ زبان پر وہ کلمات جاری ہو جاتے ہیں جو بظاہر اپنی صورت میں تعجب خیز معلوم ہوتے ہیں، جیسے "سبحانی ما اعظم شانی" یا "انا الحق"۔ ایسے اقوال کا حقیقی مفہوم یہ نہیں ہوتا کہ

عارف خود کو خدا سمجھنے لگتا ہے- ان کے پیچھے وہ کیفیتِ فنافی اللہ کار فرما ہوتی ہے جس میں انسان اپنی ذات کو مٹتا ہوا محسوس کرتا ہے اور ہر طرف صرف خدا ہی کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ صوفیانہ اصطلاح میں اسے "سکر" یعنی بے خودی کی حالت کہتے ہیں، جہاں شعورِ ذاتی ماند پڑ جاتا ہے اور شعورِ الٰہی غالب آ جاتا ہے۔ اس مقام پر عارف کا مقصد الوہیت کا دعویٰ نہیں بلکہ اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ اپنے وجود کو مکمل طور پر ربّ کے سپرد کر رہا ہے۔ اس لیے یہ الفاظ ایک روحانی واردات کا اظہار ہیں، نہ کہ عقیدے کا۔

ترجمہ: "اللہ ہی زمین و آسمان کا نور ہے۔۔۔ وہ فانوس گویا ایک ستارہ ہے جو موتی کی طرح چمک رہا ہو۔"(۲۵)

آیتِ مبارکہ میں بیان کردہ یہ تمثیل- کہ اللہ زمین و آسمان کا نور ہے اور اس کا نور ایک ایسے فانوس کی مانند ہے جس میں شیشہ موتی کی طرح جگمگاتے ستارے جیسا ہو- درحقیقت الٰہی نور کی پاکیزگی، لطافت اور ہمہ گیری کو انسان کے قریب ترین مفاہیم میں سمجھانے کا وسیلہ ہے۔ یہاں فانوس اس قلبِ مومن کی علامت ہے جو ایمان و تقویٰ سے منور ہو، شیشہ اس دل کی شفافیت اور پاکیزگی کو ظاہر کرتا ہے جو نفسانی آلودگیوں سے پاک ہو کر ربّ کے نور کو منعکس کرنے کے قابل بن جاتا ہے، اور ستارے کی مانند چمکتا ہوا چراغ اس الوہی تجلی کی شدت، تاثیر اور ازلی روشنی کی علامت ہے جو نہ صرف کائنات کے ہر گوشے کو روشن کرتی ہے بلکہ انسان کے باطن کو بھی ظلمتوں سے نجات دلاتی ہے۔ یہ تشبیہ اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہے کہ اللہ ہی ہدایت، بصیرت اور زندگی کی اصل روشنی ہے، اور انسان اسی وقت اس روشنی سے فیض پا سکتا ہے جب اس کا دل پاک، نیت خالص اور باطن الٰہی قرب سے منور ہو۔ یوں یہ تمثیل کائناتی نظم، روحانی حقیقت اور انسانی ہدایت- تینوں کا ایک بامعنی ربط پیش کرتی ہے۔

> "میری ذاتی رائے یہ ہے کہ خدا کو "نور" کے طور پر بیان کرنے کی جو تعبیر یہودی، عیسائی، اور اسلامی ادبیات میں صدیوں سے رائج ہے، آج کے دور میں ہمیں اس کے مفہوم کو جدید سائنسی و فکری تناظر میں دوبارہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جدید طبیعیات کے مطابق، روشنی یا نور کی رفتار کائنات میں ایک مستقل قدر ہے، جسے بڑھایا نہیں جا سکتا۔ یہ رفتار ہر مشاہدہ کنندہ کے لیے یکساں رہتی ہے، چاہے وہ کسی بھی رفتار سے حرکت کر رہا ہو۔ یہ خاصیت روشنی کو کائنات کے دیگر مظاہر سے منفرد بنا دیتی ہے۔ اگر اسی تصور کو الٰہیاتی تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ جب مذہبی متون میں خدا کو نور کہا گیا ہے، تو اس سے مراد محض مادی روشنی نہیں تھی بل کہ ایسی مطلق، لازوال، اور ابدی حقیقت تھی جو ہر چیز کو محیط ہے، ہر حالت میں یکساں رہتی ہے، اور جس کی صفات میں کسی قسم کی کمی بیشی یا تغیر ممکن نہیں۔ لہٰذا، جدید طبیعیات کی روشنی میں یہ تعبیر اور بھی گہرا مفہوم اختیار کر لیتی ہے کہ خدا کی ذات بھی اسی طرح لازوال، مستقل اور ہر حال میں یکساں رہنے والی ہے، جیسے روشنی کی رفتار ہر مشاہدہ کنندہ کے لیے ایک سی رہتی ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مذہبی اصطلاحات کو محض الفاظ کی حد تک محدود نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ ان کے پس پشت موجود گہرے روحانی اور علمی حقائق کو تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"(۲۶)

روشنی، جسے اکثر خدا کی مطلق فطرت کی علامت سمجھا جاتا ہے، اس الٰہی جوہر پر زور دیتا ہے جو محض ہمہ گیریت سے بالاتر ہے۔ یہ نقطہ نظر جدید سائنسی تفہیم کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے، جہاں روشنی کائنات کے بارے میں بنیادی سچائیوں کو ظاہر کرتی ہے، روحانی علامت اور عصری سائنسی بصیرت کے درمیان گہرے تعلق کو اجاگر کرتی ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ مادی وجود کی محتاج نہیں ہے، اس کی نوعیت روحانی ہے اور وہ ہر شے کو احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اسی لیے مادے سے اس کے وجود کا ثبات اس کے وجود کو مادے پر منحصر اور مشروط کرتا ہے اور اس کی متناہیت کا پتہ دیتا ہے اور اذہان وجودی و شہودی مسائل میں پھنسے رہ جاتے ہیں۔ اس مسئلے کے حل کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ ہر شے تخلیق اللہ تعالیٰ کی ہے اس لیے وہ اس کا خالق تو ہے لیکن اس میں اس طرح سے موجود نہیں جس طرح عمومی طور پر سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد آصف اعوان اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ:

"حق تعالیٰ کی ذات کائنات کے ہر ہر جوڑ بند میں موجود ہے۔"(۲۷)

مزید یہ کہ ہر شے کی اصل روحانی ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اور اس کے حکم سے ہی ہے۔ ان معانی ہی میں اس کی کائنات میں موجودگی با آسانی سمجھ آتی ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اشیاء اس کی محتاج ہیں لیکن وہ ان کا محتاج نہیں۔ علامہ محمد اقبال نے چونکہ اللہ تعالیٰ کا تخلیقی تصور پیش کیا ہے یعنی وہ مسلسل تخلیقی عمل کائنات نہیں بلکہ مسلسل تخلیقی رجحانات سے (painted) کر رہا ہے اور اس کے سامنے تخلیقی امکانات ختم نہیں ہوئے بل کہ اس کائنات میں وُسعت اور اضافہ ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر محمد آصف اعوان علامہ اقبال کے تصور خدا کی وضاحت کرتے ہوئے اس پہلو کو نمایاں کرتے ہیں کہ خدا کی تخلیقی فعالیت سے باہر کسی شے کا وجود نہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے، ہر ذرہ، ہر قانون، ہر مظہر—سب کچھ خُدا کی تخلیق کا حصہ ہیں اور اس کی قدرت اور ارادۂ مطلق سے وابستہ ہیں۔ ڈاکٹر محمد آصف اعوان لکھتے ہیں:

"گویا خدا کی تخلیقی فعالیت سے باہر کسی شے کا وجود نہیں اور کوئی مادی شے ایسی نہیں جو خدا کو محدود یا پابند کر سکے۔"(۲۸)

یہ تصور اسلامی توحید کے اس بنیادی عقیدے کی تائید کرتا ہے کہ خُدا لامحدود ہے، ازلی و ابدی ہے اور کوئی مخلوق یا مادہ اس کے دائرۂ ارادہ سے باہر نہیں۔ اقبال کی نظر میں خدا کو محدود کرنے کا کوئی فلسفیانہ یا سائنسی تصور درست نہیں کیونکہ وہی حقیقتِ مطلق ہے اور باقی سب مظاہر یا ممکنات ہیں۔ مزید برآں، ڈاکٹر آصف اعوان جدید فزکس کی روشنی میں اقبال کے تصور کو تقویت دیتے ہیں۔ ان کے مطابق جدید طبیعیات یہ بتاتی ہے کہ کائنات کوئی جامد یا ساکن وجود نہیں بل کہ واقعات کا مسلسل مربوط نظام ہے۔ کائنات میں ہر لمحہ تبدیلی اور عمل جاری ہے اور مادے کے ہر مظہر کا وجود دوسرے سے مربوط ہے۔ یہ نکتہ اس بات کی علامت ہے کہ زمان و مکان محض جامد حقیقتیں نہیں بلکہ تخلیقی امکانات ہیں جو خدا کے ارادہ و علم سے وابستہ ہیں۔ اسی تناظر میں زمان و مکان کے حوالے سے ڈاکٹر محمد آصف اعوان لکھتے ہیں:

"زمان و مکان انائے مطلق کے امکانات ہیں جن کا ہماری زمان و مکان کی ریاضیاتی شکل میں جزوی طور پر اظہار ہوتا ہے۔"(۲۹)

یہاں انائے مطلق سے مراد خُدا کی ذات ہے۔ گویا زمان و مکان بھی خُدا کی ذات سے باہر کوئی مستقل حقیقت نہیں بل کہ اس کی تخلیقی قدرت کے مظاہر ہیں۔ انسان کی سمجھ میں یہ امکانات ریاضیاتی اور طبیعیاتی قوانین کی شکل میں آتے ہیں مگر ان کا حقیقی، کلی، اور مطلق ادراک صرف خُدا کو حاصل ہے۔ اقبال کا تصور خدا اسی لیے ایمان کی اساس اور عقل کی معراج ہے کہ وہ خدا کو کائنات سے جدا بھی مانتے ہیں اور اس میں حاضر و ناظر بھی سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک زمان و مکان کی جکڑ بندیاں صرف مخلوق کے لیے ہیں، خالق ان سے ماورا بھی ہے اور ان کا خالق بھی۔ یہی تصور خدا انسان کی خودی کو حریت، مقصدیت اور تخلیقی فعالیت عطا کرتا ہے۔ کیونکہ جب انسان جان لیتا ہے کہ اس کا خُدا لامحدود ہے تو اس کا اپنا وجود بھی کسی اعلیٰ نصب العین کی تکمیل میں لگ جاتا ہے اور وہ تنگ نظری، مادہ پرستی، اور جمود سے نکل کر حریت فکر، قوت عمل، اور دعا کی حرارت سے نئی دنیا تخلیق کرنے کے قابل ہوتا ہے۔

علامہ محمد اقبال کے نزدیک کائنات اور خُدا کی نسبت کوئی ایسی دوئی نہیں جو حقیقت مطلقہ میں موجود ہو۔ ان کے خیال میں کائنات خدا کی غیر یا مقابل شے نہیں ہے۔ یہ نہ تو کسی اچانک حادثے یا اتفاق کا نتیجہ ہے اور نہ ہی اس کی تخلیق کا عمل کسی خاص آغاز یا اختتام کا محتاج ہے۔ خالق اور مخلوق کی دوئی محض انسانی فکر کی پیداوار ہے۔ انسانی عقل چوں کہ تخلیق کے اس مسلسل عمل کو بیک وقت کلیت کے ساتھ دیکھنے سے قاصر ہے، اس لیے وہ اسے اجزاء میں تقسیم کر کے سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔

ہماری فکر یا ہماری توجیہات ایک مسلسل عمل کو یا کسی بھی تخلیقی عمل کو اجزاء میں اس لیے تقسیم کر دیتی ہے کہ ہم اسے سمجھ سکیں حالاں کہ وہ عمل جزواً نہیں بلکہ ایک کل کی صورت میں ہوتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر برگساں کے نظریۂ ارتقا تخلیقی (Creative Evolution) اور وائٹ ہیڈ کے تصورِ واقعہ (Event) کی تائید کرتا ہے کہ کائنات محض میکانکی ترتیب نہیں بل کہ تخلیقی تسلسل ہے۔

وائٹ ہیڈ کے حوالے سے علامہ اقبال لکھتے ہیں:

"جوہر مکان سے اس طرح گزر نہیں کرتا کہ برابر ایک راستے پر چلتا رہے۔"(۳۰)

یہ قول ظاہر کرتا ہے کہ جوہر (Substance or Entity) محض کسی میکانکی خط پر سفر نہیں کرتا بلکہ یہ ایک تخلیقی، حیاتیاتی اور مسلسل بدلتا ہوا عمل ہے۔ اشاعرہ کے نظریے پر تنقید کرتے ہوئے اقبال واضح کرتے ہیں کہ اگرچہ اشاعرہ نے مادے اور روح کو تجزیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا لیکن ان کا یہ موقف کہ روح بھی لطیف مادے کی صورت ہے، روحانیت کو میکانکی مظہر تک محدود کر دیتا ہے۔ جیسا کہ علامہ اقبال لکھتے ہیں:

"جواہر۔۔۔مادہ کی کوئی لطیف صورت ہے یا محض ایک عرض ہے۔"(۳۱)

اقبال کے نزدیک جواہر کی حقیقت بھی روحانی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مادے کے اجزاء، ذرات، اور جواہر سب خُدا کی تخلیق کے روحانی امکانات ہیں نہ کہ محض مادی ترکیبیں۔ اس سے ان کا نظریہ اسلامی وحدت الوجود کے تصور سے ہم آہنگ دکھائی دیتا ہے جہاں کائنات کی ہر شے کا اصل منبع اور حقیقت خُدا کی ذات ہے۔ تاہم اقبال کا علمی دیانت داری پر مبنی رویہ یہاں بھی سامنے آتا ہے۔ انہوں نے اشاعرہ کے نظریات کو مکمل رد کرنے کے بجائے ان کی مثبت علمی حیثیت کو سراہا ہے۔ وہ اسے جدید طبیعیات کے بعض

تصورات کا ابتدائیہ قرار دیتے ہیں۔ پروفیسر میگڈونلڈ کی تنقید کو وہ تعصب پر مبنی قرار دیتے ہوئے اشاعرہ کے علمی کارنامے کو یوں تسلیم کرتے ہیں:

"درحقیقت شاعرہ نے 'نقطے۔ لمحے' کے جدید نظریے کی ایک دھندلی سے پیش بینی کی، مگر وہ نقطے اور لمحے کے باہمی تعلق کی نوعیت کو درست طور پر جاننے میں ناکام ہو گئے۔"(۳۲)

یہ جملہ اس بات کا غماز ہے کہ علامہ اقبال نے اشاعرہ کی فکر کو غیر جانبداری اور علمی انصاف کے ساتھ پرکھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگرچہ اشاعرہ کائنات کی حقیقت کو مکمل طور پر نہ سمجھ سکے لیکن ان کا یہ تصور کہ کائنات جواہر اور لمحاتی وحدتوں پر مشتمل ہے، جدید طبیعیات کے کوانٹم تھیوری اور زمان و مکان کی وحدت جیسے تصورات کی تمہید فراہم کرتا ہے۔

علامہ اقبال نے انائے مطلق کا تصور پیش کرتے ہوئے اسے ایسی کامل اور مطلق خودی قرار دیا ہے جس کی تخلیقی قدرت میں فکر اور عمل کی کوئی جدائی نہیں، یعنی وہ جب ارادہ کرتا ہے تو اس کے ارادے اور عمل کے درمیان کوئی وقفہ یا تاخیر نہیں ہوتی۔ خدا کی ذات کے لیے سب کچھ بلا توقف ممکن ہے۔ اقبال کے نزدیک انسانی خودی کے بھی دو پہلو ہیں؛ پہلا انائے فعال جو انسان کو عمل، ارادے اور تخلیق کی قوت عطا کرتا ہے، اور دوسرا انائے بصیر جو اسے حقیقت کا ادراک، بصیرت اور شعور بخشتی ہے۔ جب انسان کی خودی ان دونوں پہلوؤں کو متوازن اور مکمل طور پر ترقی دیتی ہے تو وہ بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہے اور اسی قدر انائے مطلق یعنی خدا کی صفات سے قریب تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح اقبال کا تصورِ خودی انسان کو خدا سے دور نہیں کرتا بل کہ اس کے قرب کی راہوں کو روشن کرتا ہے۔

"تصورِ خدا اور حقیقتِ دعا" کے مطالعے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبال نے خدا کو محض ایک نظری تصور یا عقیدے کی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے انسانی زندگی کی روح اور اساس قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک خدا ہی وہ پہلی حقیقت ہے جس سے کائنات کی تخلیق وجود میں آئی اور اسی کی ذات اس تخلیق کا مقصود بھی ہے۔ اقبال کے تصورِ خدا میں جہاں قرآن کی خالص توحید کا جوہر جھلکتا ہے، وہیں مغربی فلسفے، جدید فکری رجحانات اور اسلامی تصوف کے بعض عناصر کی چھاپ بھی ملتی ہے، لیکن ان کی فکر کی عظمت یہ ہے کہ وہ خدا کو ایک ایسی مطلق ہستی کے طور پر پیش کرتے ہیں جو نہ صرف قادر مطلق، بے نیاز اور صاحب جبروت ہے بلکہ انسان کے دل کے قریب، محبت کرنے والی اور اس سے براہِ راست تعلق رکھنے والی ذات بھی ہے۔ اس طرح اقبال کا خدا کا تصور انسان کی روحانی، فکری اور عملی زندگی کو ایک مکمل نظام فراہم کرتا ہے اور اسے مقصد، قوت اور یقین عطا کرتا ہے۔

حقیقتِ دعا کے ضمن میں اقبال کا تصور خالص اسلامی تعلیمات سے ماخوذ ہے۔ ان کے نزدیک دعا فقط ایک رسمی عمل یا الفاظ کا ورد نہیں بلکہ انسان کی روح کی پکار، اس کے باطن کی سچائی اور اس کے ارادے کی شدت ہے۔ دعا میں انسان اپنی ذات کی گہرائیوں سے نکل کر خُدا کے حضور پیش ہوتا ہے۔ اقبال اس دعا کو محض عاجزانہ التجا نہیں کہتے بلکہ ایک تخلیقی عمل قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق، دعا انسان کی خلاقی قوت کو بیدار کرتی ہے، اس کی روح میں نئی حرارت اور عزم پیدا کرتی ہے اور اس کے ارادوں کو خُدا کی تائید نصیب ہوتی

ہے۔ اقبال کے نزدیک خُدا کا تصور ایسا ہے جس سے انسان کی خودی کو جلا ملتی ہے اور حقیقتِ دعا وہ عمل ہے جو انسان کی خودی کو حرارت اور توانائی عطا کرتا ہے۔

اقبال کے خطبات کا مطالعہ اس بات پر مہرِ تصدیق ثبت کرتا ہے کہ اُن کے یہاں مذہب کوئی جامد نظام نہیں بلکہ ایک زندہ اور متحرک قوت ہے۔ خُدا کی ہستی کے ساتھ تعلق محض عبادات یا فلسفیانہ استدلال تک محدود نہیں رہتا بلکہ یہ تعلق ایک عملی، اخلاقی اور روحانی انقلاب برپا کرتا ہے۔ خُدا پر یقین انسان کو قوتِ عمل عطا کرتا ہے۔ اس کے برعکس، خُدا سے غفلت انسان کو کمزور، بے مقصد اور انتشار کا شکار کر دیتی ہے۔ اقبال کے نزدیک خُدا کا تصور انسانی شخصیت کو جامعیت عطا کرتا ہے کیونکہ جب انسان خُدا کو مان لیتا ہے تو وہ اس کائنات میں اپنا مقام بھی پہچان لیتا ہے اور اپنی ذمہ داریوں کا بھی ادراک کر لیتا ہے۔

دعا کی حقیقت پر بحث کرتے ہوئے اقبال اس غلط فہمی کو رد کرتے ہیں کہ دعا تقدیر کے خلاف کوئی بغاوت یا تبدیلی لانے کی کوشش ہے۔ ان کے مطابق، تقدیر جامد نہیں بلکہ خُدا کا زندہ نظام ہے جس میں دعا اور عمل دونوں شامل ہیں۔ انسان جب خلوصِ دل سے دعا کرتا ہے تو وہ دراصل اپنے ارادے کو خُدا کی رضا کے تابع کر کے اپنی تقدیر کو سنوارتا ہے۔ اقبال دعا کو انسانی خودی کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں، دعا انسان کو خُدا سے جوڑتی ہے، اسے اپنی کمزوریوں کا احساس دلا کر اُس کی قوت کو دوچند کر دیتی ہے۔ اس طرح دعا ایک فرد کی اصلاح سے بڑھ کر ایک پورے معاشرے کی تطہیر اور تعمیر میں بھی اپنا کردار ادا کرتی ہے۔

آخر میں، کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کا تصورِ خُدا اور حقیقتِ دعا دونوں مل کر ایک مکمل دینی اور فکری نظام تشکیل دیتے ہیں جس میں انسان خُدا کی عبادت اور دعا کے ذریعے اپنی زندگی کو مقصدیت، عزم، حوصلے، عمل اور معنویت سے بھر دیتا ہے۔ یہ تصور انسان کو جبر و تقدیر کی زنجیروں میں جکڑنے کے بجائے عمل، جدوجہد اور دعا کے امتزاج سے ایک فعال، بیدار، خوددار اور باوقار انسان بنانے کی ترغیب دیتا ہے۔ اقبال کے نزدیک، انسان کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ وہ خُدا کے تصور کو اپنا مرکز بنا کر دعا کی حرارت سے اپنی خودی کو جلا بخشے اور اس دنیا میں خُدا کے نائب کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں ادا کرے۔ ان کا یہ پیغام آج کے انسان کے لیے بھی اتنا ہی تازہ اور زندہ ہے جتنا ان کے اپنے عہد کے لیے تھا۔

اقبال کے اس قول سے واضح ہوتا ہے کہ انسان کی ذات میں پنہاں انائیت یا خودی کا یہ سفر محض فرد کی نفسیاتی یا روحانی ارتقاء تک محدود نہیں رہتا بل کہ یہ پورے معاشرتی اور کائناتی نظام کو متاثر کرتا ہے۔ جب انسان اپنی خودی کو پہچان لیتا ہے اور اس کی تربیت خُدا کے تصور اور دعا کی حقیقت کے ذریعے کرتا ہے تو اس کا وجود خیر، عدل، محبت اور تعمیرِ کائنات کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ جیسا کہ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

"ہستی کے سارے سرگم میں انائیت کا سر بتدریج بلند تر ہوتا چلا جاتا ہے۔"(۳۳)

یہ بلند ہوتی ہوئی انائیت انسان کو نہ غرور سکھاتی ہے نہ انانیت کی نفی کرتی ہے بل کہ اسے خُدا کی بندگی اور خودی کی تربیت کا حسین امتزاج عطا کرتی ہے۔ یہی تصورِ عبادت اور حقیقتِ دعا ہے کہ انسان خُدا سے جڑ کر اپنی ذات کی تکمیل کرے اور دوسروں کے لیے باعثِ رحمت بنے۔ اسی حقیقت کو ڈاکٹر آصف اعوان نے نہایت جامع انداز میں بیان کیا ہے۔

"مختصر یہ کہ اقبال کے نزدیک اسلامی نظام عبادت معاشرے میں علم و حکمت، اخوت و مساوات، ہمدردی اور باہمی تعاون کے جذبے پر مبنی نیکی اور راست بازی کا ایسا ذہنی میلان پیدا کرنا چاہتا ہے کہ جس کے باوصف معاشرے میں رہنے والا، ہر فرد دوسرے فرد کی جان، مال اور عزت کے لیے رحمت و رافت اور سلامتی کا باعث ہو۔"(۳۴)

پس اقبال کے نزدیک تصور خُدا اور حقیقتِ دعا محض عقائد یا عبادات کا مجموعہ نہیں بلکہ یہ ایک ایسا مکمل اخلاقی و روحانی نظام ہے جو فرد کی شخصیت کو استحکام عطا کر کے اُسے معاشرے میں خیر، محبت، عدل، علم، حکمت اور تعمیری سرگرمیوں کا منبع بنا دیتا ہے۔ ان کے خیال میں اگر دعا صرف زبان کی حرکت بن کر رہ جائے اور تصورِ خُدا محض فلسفیانہ بحث تک محدود ہو تو انسان کی روح مردہ ہو جاتی ہے۔ لیکن جب یہی دعا خلوص دل، شدت طلب، اور سوز دروں کے ساتھ ادا کی جاتی ہے اور خُدا کا تصور دل و دماغ کو منور کر دیتا ہے تو فرد کی خودی بیدار ہوتی ہے، اس کے ارادے میں تاثیر پیدا ہوتی ہے اور اس کی زندگی پورے معاشرے کے لیے رحمت و سعادت بن جاتی ہے۔

اقبال کی تعلیمات کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان کی حقیقی کامیابی اور عظمت کا تعلق صرف دنیاوی کامیابیوں یا مادی ترقیات سے نہیں بلکہ اللہ کے ساتھ تعلق اور روحانی بیداری سے ہے۔ دعا اور عبادت انسان کو اپنے خالق کے قریب لاتی ہیں اور خودی کی تجلی کے ذریعے وہ اپنی فطری صلاحیتوں کو پہچان کر ان کا مثبت استعمال کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک یہی انسان کی معراج ہے۔ وہ مقام جہاں انسان نہ صرف اپنے اندرونی نفس کی تکمیل حاصل کرتا ہے بلکہ خلیفۃ اللہ کے منصب کی ذمہ داری کو بھی سمجھتا اور عملی طور پر ادا کرتا ہے۔ اس طرح انسان کی زندگی میں روحانی بلندی، اخلاقی کردار اور معاشرتی خدمات کا حسین امتزاج پیدا ہوتا ہے، جو اقبال کے فلسفۂ خودی اور عبادت کا حقیقی جوہر ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ محمد عارف خان، ڈاکٹر، مُباحث خطبات اقبال، بُک کارنر، جہلم، ۲۰۱۹ء، ص ۷
۲۔ محمد شریف بقا، خطباتِ اقبال ایک جائزہ، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۴۹
۳۔ حمید تنولی، ڈاکٹر، معاصر تہذیبی کشمکش اور فکرِ اقبال، اظہار سنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۵۴۱
۴۔ خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، تلخیص خطباتِ اقبال، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۶۳
۵۔ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال اردو، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۲۳۴
۶۔ این میری شمل، مترجم، نعیم اللہ ملک، روح جبریل، ابوذر پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۸۷
۷۔ محمد اقبال، علامہ، بحوالہ: مظفر حسین برنی، مرتبہ، مکاتیب اقبال، جلد اوّل، بک کارنر، جہلم، ۲۰۱۶ء، ص ۷۷۳
۸۔ خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، تلخیص خطباتِ اقبال، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۴۶
۹۔ محمد عثمان، پروفیسر، فکرِ اسلامی کی تشکیلِ نو، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۷۱

۱۰۔ محمد شریف بقا، موضوعات خطبات اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۱۰
۱۱۔ آصف اعوان، ڈاکٹر، اقبال کا تیسرا خطبہ۔ تحقیقی و توضیحی مطالعہ، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۸۰
۱۲۔ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال اردو، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۳۵۶
۱۳۔ محمد اقبال، علامہ، خطبہ، مشمولہ: "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ"، مترجم: نذیر نیازی، سید، (لاہور: بزم اقبال، ۲۰۱۰ء) ص ۱۴۶
۱۴۔ ایضاً، ص ۱۴۹
۱۵۔ محمد اقبال، ڈاکٹر، دی ری کنسٹرکشن آف ریلیجئس تھاٹ ان اسلام، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۸۹ء، صفحہ ۷
۱۶۔ وحید الدین، سید، فلسفہ اقبال خطبات کی روشنی میں، نذیر سنز پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۵۵
۱۷۔ محمد اقبال، علامہ، خطبہ، مشمولہ: تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، مترجم: نذیر نیازی، سید، ص ۱۱۶
۱۸۔ وحید الدین، سید، فلسفہ اقبال خطبات کی روشنی میں، نذیر سنز پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۵۵
۱۹۔ نذیر نیازی، سید، اقبال کے حضور، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۳۸۷
۲۰۔ محمد اقبال، علامہ، خطبہ، مشمولہ: تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، مترجم: نذیر نیازی، سید، بزم اقبال، لاہور، ۲۰۱۰ء ص ۱۴۵
۲۱۔ پروفیسر محمد عارف خان، ڈاکٹر، مباحث خطبات اقبال، بک کارنر، جہلم، ۲۰۱۹ء، ص ۲۳۲
۲۲۔ محمد اقبال، علامہ، خطبہ، مشمولہ: تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، مترجم: نذیر نیازی، سید، ص ۱۴۸
۲۳۔ ایضاً، ص ۱۴۷
۲۴۔ محمد آصف اعوان، ڈاکٹر، اقبال کا تیسرا خطبہ: تصور خدا اور عبادت کا مفہوم (تحقیقی و توضیحی مطالعہ)، ص ۸۰
۲۵۔ وحید عشرت، ڈاکٹر، تجدید فکریاتِ اسلام، اقبال اکادمی، لاہور، طبع سوم، ۲۰۱۱ء، ص ۹۶
۲۶۔ ایضاً، ص ۹۶
۲۷۔ محمد آصف اعوان، ڈاکٹر، اقبال کا تیسرا خطبہ: تصور خدا اور عبادت کا مفہوم (تحقیقی و توضیحی مطالعہ)، ص ۳۵
۲۸۔ محمد آصف اعوان، ڈاکٹر، معارف خطباتِ اقبال، نشریات، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۷۶
۲۹۔ ایضاً، ص ۸۵
۳۰۔ محمد اقبال، علامہ، خطبہ، مشمولہ: تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، مترجم: نذیر نیازی، ص ۱۲۳
۳۱۔ محمد اقبال، علامہ، بحوالہ: وحید عشرت، ڈاکٹر، تجدید فکریاتِ اسلام، اقبال اکادمی، لاہور، طبع سوم، ۲۰۱۱ء، ص ۲۹
۳۲۔ محمد اقبال، علامہ، بحوالہ: محمد آصف اعوان، ڈاکٹر، معارف خطباتِ اقبال، نشریات، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۶۷
۳۳۔ محمد اقبال، علامہ، بحوالہ: وحید عشرت، ڈاکٹر، تجدید فکریاتِ اسلام، اقبال اکادمی، لاہور، طبع سوم، ۲۰۱۱ء، ص ۹۶
۳۴۔ محمد آصف اعوان، ڈاکٹر، معارف خطباتِ اقبال، نشریات، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۰۳

References in Roman Script:

1. Muhammad Arif Khan, Dr., Mubahis Khutbat-e-Iqbal, Book Corner, Jhelum,

2019, p.7
2. Muhammad Sharif Baqa, Khutbat-e-Iqbal aik Jaiza, Iqbal Academy, Lahore, 1991, p. 94
3. Hamid Tanoli, Dr., Muasir Tehzibi Kashmakash aur Fikr-e-Iqbal, Izhar Sons, Lahore, 2015, p. 541
4. Khalifa Abdul Hakim, Dr., Talkhees Khutbat-e-Iqbal, Bazm-e-Iqbal, Lahore, 1988, pp. 36
5. Muhammad Iqbal, Allama, Kulliyat-e-Iqbal (Urdu), National Book Foundation, Islamabad, 2016, p. 234
6. Annemarie Schimmel, Translator: Naeemullah Malik, Rooh-e-Jibreel, Abuzar Publications, Lahore, 2015, p. 187
7. Muzaffar Hussain Barni (Compiler), Makateeb-e-Iqbal, Vol. I, Book Corner, Jhelum, 2016, p. 773
8. Khalifa Abdul Hakim, Dr., Talkhees Khutbat-e-Iqbal, Bazm e Iqbal, Lahore, 1988, p. 46
9. Muhammad Usman, Prof., Fikr-e-Islami ki Tashkeel-e-Nau, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2011, p. 17
10. Muhammad Sharif Baqa, Mozuat-e-Khutbat-e-Iqbal, Iqbal Academy Pakistan, Lahore, 2007, p. 110
11. Asif Awan, Dr., Iqbal ka Teesra Khutba: Tahqiqi wa Tozeehi Mutala'a, Misaal Publishers, Faisalabad, 2010, p. 180
12. Muhammad Iqbal, Allama, Kulliyat-e-Iqbal (Urdu), National Book Foundation, Islamabad, 2016, p. 356
13. Muhammad Iqbal, Allama, Khutba, mashmoola: Tashkeel-e-Jadeed Ilahiyat-e-Islamiya, Trans. Syed Nazir Niazi, Bazm-e-Iqbal, Lahore, 2010, p. 146
14. Ibid., p. 149
15. Muhammad Iqbal, Dr., The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Iqbal Academy, Lahore, 1989, p. 7
16. Waheed-ud-Din, Sayyed, Falsafa-e-Iqbal Khutbat ki Roshni Mein, Nazir Sons Publishers, Lahore, 2010, p. 55
17. Muhammad Iqbal, Allama, Khutba, mashmoola: Tashkeel-e-Jadeed Ilahiyat-e-Islamiya, Trans. Nazir Niazi, Sayyed, p. 116
18. Waheed-ud-Din, Sayyed, Falsafa-e-Iqbal Khutbat ki Roshni Mein, Nazir Sons Publishers, Lahore, 2010, p. 55
19. Nazir Niazi, Sayyed, Iqbal ke Huzoor, Iqbal Academy Pakistan, Lahore, 1981, p. 387
20. Muhammad Iqbal, Allama, Khutba, mashmoola: Tashkeel-e-Jadeed Ilahiyat-e-Islamiya, Trans. Syed Nazir Niazi, Bazm-e-Iqbal, Lahore, 2010, p. 145
21. Muhammad Arif Khan, Prof. Dr., Mubahis Khutbat-e-Iqbal, Book Corner, Jhelum, 2019, p. 232
22. Muhammad Iqbal, Allama, Khutba, mashmoola: Tashkeel-e-Jadeed Ilahiyat-e-Islamiya, Trans. Nazir Niazi, Sayyed, p. 148
23. Ibid, p. 147

24. Muhammad Asif Awan, Dr., Iqbal ka Teesra Khutba: Tasawwur-e-Khuda aur Ibadat ka Mafhoom (Tahqiqi wa Tozeehi Mutala'a), p. 80
25. Waheed Ishrat, Dr., Tajdeed-e-Fikriyat-e-Islam, Iqbal Academy, Lahore, 3rd ed., 2011, p. 96
26. Ibid, p. 96
27. Muhammad Asif Awan, Dr., Iqbal ka Teesra Khutba: Tasawwur-e-Khuda aur Ibadat ka Mafhoom, p. 35
28. Muhammad Asif Awan, Dr., Ma'arif Khutbat-e-Iqbal, Nashriyat, Lahore, 2009, p. 76
29. Ibid, p. 85
30. Muhammad Iqbal, Allama, Khutba, mashmoola: Tashkeel-e-Jadeed Ilahiyat-e-Islamiya, Trans. Nazir Niazi, p. 123
31. Muhammad Iqbal, Allama, Bahawal: Waheed Ishrat, Dr., Tajdeed-e-Fikriyat-e-Islam, Iqbal Academy, Lahore, 3rd edition, 2011, p. 29
32. Muhammad Asif Awan, Dr., Ma'arif Khutbat-e-Iqbal, Nashriat, Lahore, 2009, p. 67
33. Muhammad Iqbal, Allama, Bahawal: Waheed Ishrat, Dr., Tajdeed-e-Fikriyat-e-Islam, Iqbal Academy, Lahore, 3rd edition, 2011, p. 69
34. Mohammad Asif Awan, Dr, Ma'arif Khutbat-e-Iqbal, Nashriat, Lahore, 2009, p. 103

Dr. Talib Hussain Hashmi is an Assistant Professor of Urdu (Adjunct) at MY University, Islamabad. He earned his PhD from Allama Iqbal Open University, specializing in Urdu Fiction and Iqbaliyat. Dr. Hashmi has published twenty research articles and three books and received several honors, including the Hakim-ul-Ummat Award (2024), Allama Iqbal Gold Medal (2024), and Mehkan Literary Award (2024). He has also led research projects on Iqbal studies, including Editing of Kalam-e-Iqbal Urdu (2023) and a 2024 initiative on Iqbal's writing style, political themes in Masnavi "Pas Che Baid Kurd", and Bashir Ahmed Nahvi's Iqbalistic thought.

Mrs. Attia Qudus is an M.Phil. Urdu scholar in the Department of Urdu at MY University, Islamabad, Pakistan. She completed her M.A. in Urdu and M.A. in Islamiat from the University of the Punjab, Lahore, and her B.Ed. and M.Ed. from Allama Iqbal Open University, Islamabad. Her research interests include Urdu fiction and Iqbaliyat.